49896/366

بسم اللہ الرحمن الرحیم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام مندرجہ ذیل مسئلے کے بارے میں کہ:

اگر کسی شخص کے پاس رہائش کے لیے ذاتی مکان نہ ہو اور وہ رہائش کی غرض سے پلاٹ خریدے لیکن تعمیر کے لیے پیسے نہ ہونے کی وجہ سے [illegible] اس پر گھر نہ بنایا ہو اور اس شخص کے پاس مذکورہ پلاٹ کے علاوہ نصاب کے بقدر حاجتِ اصلیہ سے زائد مال واسباب نہ ہوں تو ایسے شخص کو زکوۃ دے سکتے ہیں یا نہیں؟ اور اگر اسی اثناء قربانی کے دن آ گئے تو اس پلاٹ کی قیمت قربانی کے نصاب میں شمار کی جائیگی یا اس پلاٹ کو حوائج اصلیہ میں داخل مان کر اس کی قیمت کا قربانی کے نصاب میں اعتبار نہیں کیا جائے گا؟

جبکہ جامعہ دارالعلوم کراچی کے فتویٰ نمبر (۱۳۴۳/۱۱۔جزء نمبر: الف) میں اس قسم کے پلاٹ کو حوائج اصلیہ میں داخل مان کر ایسے شخص کے لیے زکوۃ لینے کی گنجائش دی گئی ہے اور قربانی اور صدقۂ فطر کے نصاب سے اس پلاٹ کو مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ اس مسئلہ کے بارے میں تفصیلی حکم سے آگاہ فرما کر ممنون فرمائیں۔ مذکورہ فتویٰ کی کاپی سوال کے ساتھ منسلک ہے۔ جزاکم اللہ خیرا

المستفتی: عبداللہ

احاطہ جامعہ دارالعلوم کراچی

دار الافتاء ۸۱/۲۶۹

(جواب منسلک ہے)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب حامداً و مصلیاً

اگر کسی شخص کے پاس ذاتی مکان نہ ہو اور اس کے پاس ایک ایسا پلاٹ ہو جو اس نے اپنی رہائش کی نیت سے خریدا ہو، لیکن تعمیری اخراجات کے لیے رقم نہ ہونے کی وجہ سے اس پلاٹ پر ابھی تک تعمیر نہ کی ہو، تو یہ پلاٹ "حوائج اصلیہ" میں داخل سمجھا جائے یا اس کو "حوائج اصلیہ" سے زائد مان کر وجوبِ قربانی وصدقۂ فطر اور حرمانِ اخذِ صدقہ کے نصاب میں شمار کیا جائے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر مالک نے اس پلاٹ کو کرایہ پر دیا ہوا ہو اور اس کا گزر بسر اس پلاٹ سے حاصل ہونے والے کرایہ پر ہو تو اس صورت میں یہ پلاٹ اس شخص کے "نان ونفقہ" کی "حاجتِ اصلیہ" کے ساتھ مشغول ہونے کی وجہ سے مذکورہ نصاب میں شمار نہیں ہو گا۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو یعنی وہ پلاٹ اس شخص کے نان ونفقہ کی حاجتِ اصلیہ کے ساتھ مشغول نہ ہو تو کیا اس کو "سکنیٰ" کی "حاجتِ اصلیہ" میں داخل سمجھا جائے یا نہیں۔ اس صورتِ حال سے متعلق عرض ہے کہ یہاں دو پہلو ہیں:

ایک پہلو تو یہ ہے کہ: اگرچہ اس شخص کا ذاتی گھر نہیں ہے، لیکن چونکہ فی الحال یہ شخص اس پلاٹ کو استعمال نہیں کر رہا ہے اور دوسری جگہ میں اس کو رہائش بھی میسر ہے اگرچہ کرایہ کی یا عارضی ہو، اس لیے اس پلاٹ کو مذکورہ شخص کے "سکنیٰ" کی "حاجتِ اصلیہ" سے زائد قرار دیا جائے، اور وجوبِ قربانی وصدقۂ فطر اور حرمانِ اخذِ صدقہ کے نصاب میں اس کو شمار کیا جائے۔

"الفتاوی البزازیة"، "خلاصة الفتاوی"، "الفتاوی التاتارخانیة" اور "المحیط البرهانی" کی مندرجہ ذیل عبارات سے بھی بظاہر اس رائے کی تائید ہوتی ہے۔

الفتاوی البزازیة، کتاب الأضحیة (۱۵۵/۳) ط: دارالفکر

فرومابه اشتری فرساً نرکبهٔ و یسعیٰ علیه فی أموره، بلغ نصاباً، لا تلزم و لو کان فی دار بإجارة، فاشتری أرضاً بنصاب وبنی فیها منزلاً یسکنه، لزمت. (أی الأضحیة).

خلاصة الفتاوی، کتاب الأضحیة (۳۱۰/٤)

و فی الأجناس: رجل له زمانة اشتری حماراً یرکبه و یسعی فی حوائجه و قیمته مأتا درهم فلا أضحیة علیه، و لو کان فی دار بکراء فاشتری قطعة أرض بمأتی درهم فبنی فیها داراً یسکنها فعلیه الأضحیة.

Scanned by CamScanner

الفتاوى التاتارخانية، الفصل الثامن من توضع فيه الزكاة (٣/٢١٧) ط. مكتبة فاروقية

و الحاصل أن ما يكون مشغولاً بالحاجة الأصلية كالخادم و المسكن وثيابه التي يلبسها في الحال لا يعتبر في حرمة الصدقة بالإجماع، وما يكون فاضلاً عن حاجته الأصلية يعتبر في حرمة الصدقة

المحيط البرهاني، الفصل الثامن من توضع فيه الزكاة (٣/٢١٧، ٢١٦) ط. إدارة القرآن، كراتشي

وسئل محمد بن الحسن عمن له أرض يزرعها أو حوانيت يستغلها، قال: إن كانت غلته تكفي لنفسه ونفقة عياله سنة لا يحل له أخذ الزكاة، وهو قول أبي حنيفة وأبي يوسف، وإن كانت غلتها لا تكفي لنفسه ونفقة عياله سنة، قال محمد: يحل له أخذ الزكاة وإن كانت تبلغ قيمتها ألوفاً، قال محمد رحمه الله: لست أنظر في هذا إلى قيمتها وإنما أنظر إلى دخلها، وقال أبو حنيفة وأبو يوسف: لا يحل له أخذ الزكاة إذا كانت تبلغ قيمتها نصاباً.

والحاصل أن ما يكون مشغولاً بالحاجة الأصلية كالخادم والمسكن، وثيابه التي يلبسها في الحال لا يعتبر في حرمة الصدقة بالإجماع، وما يكون فاضلاً عن حاجته الأصلية يعتبر في حرمة الصدقة، وإنما اختلفوا في الفراغ عن حاجة الأصلية في التحريم، لأنا لو اعتبرنا الفراغ عن الحاجة الأصلية [١] لا يتصور التحريم؛ لأن الإنسان عندي يحتاج إلى جميع ما في يديه في الشأن

إذا ثبت هذا فنقول: الضيعة فارغة عن الحاجة الأصلية حقيقة، فاعتبرناها في حرمة الصدقة اعتباراً للحقيقة، وبقولهما أخذ أبو عبد الله البلخي. ومحمد رحمه الله اعتبره من الحاجة الأصلية؛ لأن المالك في الضيعة لا يستحدث حاجة مساعدة، فمن لم يحل له الصدقة يحتاج إلى بيعها إذا كانت غلتها لا تكفي لنفسه ونفقة عياله سنة، ويتعسر على كل أحد بيع الضيعة، فاعتبر الضيعة من حوائجه الأصلية دفعاً للمشقة عن الناس، وبقوله أخذ محمد بن مقاتل ومحمد بن سلمة، بخلاف ما إذا كانت غلتها تكفي لنفسه ونفقة عياله سنة؛ لأنه لم يكن كالمشغول يحتاج إلى بيعها وما يحل له الصدقة، فلا تعتبر الضيعة والحالة هذه من حوائجه الأصلية فتعتبر في حرمة الصدقة

(١) كذا في نسخة من الكتب الحديثة، ونسخة إدارة القرآن، ولا يبدو صحيحاً في هو خلاف سياق الكلام، والظاهر أنه محرف عن "نقالة" والله تعالى أعلم ١٢ مف

جبکہ دوسرا پہلو یہ ہے کہ: اصل یہ ہے کہ انسان کے پاس اپنا گھر ہو، چاہے معمولی درجے کا ہی کیوں نہ ہو، اور مذکورہ صورت میں پلاٹ کا مالک فی الحال اگرچہ اس پلاٹ کو استعمال نہیں کر رہا ہے، لیکن استعمال نہ کرنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس کو اس پلاٹ کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ استعمال نہ کرنا تعمیر کے لیے رقم نہ ہونے کے عذر کی وجہ سے ہے۔ ورنہ اس کی ضرورت تو برقرار ہے، اس لیے کہ اگر پلاٹ نہیں ہوگا تو گھر کی تعمیر کیسے کرے گا۔ اس لیے اس پلاٹ کو "حاجتِ اصلیہ" میں داخل ماننا چاہیے اور نصاب میں شمار نہیں کرنا چاہیے۔

نیز "حوائجِ اصلیہ" کا مدار زیادہ تر عرف پر ہے، یعنی عرف میں جو چیزیں "حوائجِ اصلیہ" میں داخل مانی جاتی ہیں، ان کو فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے "حوائجِ اصلیہ" میں داخل فرمایا ہے، اور اس وقت عرف ورواج یہی ہے کہ جو کم آمدنی والے لوگ ہیں وہ مکان وغیرہ کی تعمیر کے لیے آہستہ آہستہ چیزیں خریدتے ہیں اور تعمیر کرتے جاتے ہیں، مثلاً پہلے پلاٹ خریدتے ہیں، پھر تعمیر کے لیے زمین ہموار کرتے ہیں، پھر بنیادیں ڈالتے ہیں وغیرہ وغیرہ، اس لیے مذکورہ پلاٹ کو "حوائجِ اصلیہ" سے خارج کر کے قربانی کے نصاب میں شمار کرنا "یسّروا و لاتعسّروا" اور "من وجد سَعَةً" وغیرہ نصوص کی وجہ سے قابلِ تأمل ہے۔ نیز اس پلاٹ کو "حوائجِ اصلیہ" سے زائد ماننے کی صورت میں اگر مالک کے پاس قربانی کے لیے پیسے نہیں ہوں گے تو قربانی کے لیے جانور خریدنے کے واسطے اسے یہ پلاٹ بیچنا پڑے گا اور پلاٹ بیچنے میں حرجِ شدید ہے۔ (ملاحظہ فرمائیں عبارت نمبر:۵)

جہاں تک پہلی رائے کی تائید میں ذکر کردہ عبارات کا تعلق ہے تو "الفتاویٰ التاتارخانیة" اور "المحیط البرهانی" کی عبارات میں مذکور "الحاجة الحالية" میں یہ تاویل کی جاسکتی ہے کہ حاجتِ حالیہ عام ہے، خواہ بالفعل ہو یا بالقوۃ۔

اور "الفتاوی البزازیة" اور "خلاصة الفتاویٰ" کی عبارات گھر سے متعلق ہے یعنی ذاتی گھر بنانے کے باوجود وہ کرایہ کے گھر میں رہائش پذیر ہے اور ابھی تک اس نے تعمیر کردہ ذاتی گھر میں رہائش اختیار نہیں کی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکان اس کی "حاجتِ اصلیہ" سے زائد ہے، اگر وہ اس مکان کا محتاج ہوتا تو اس میں رہائش اختیار کر لیتا۔ لیکن پلاٹ کی صورتِ حال اس سے مختلف ہے، کیونکہ خالی پلاٹ میں تو مالک رہائش اختیار کرنے

دار الافتاء

Scanned by CamScanner

پر قادر ہی نہیں ہے، اس لیے مذکورہ خالی پلاٹ کو "الفتاوی البزازیة" اور "خلاصة الفتاوی" میں ذکر کردہ گھر کی صورت پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

اس دوسری رائے کی تائید "ردالمحتار" کی اس عبارت سے بھی ہوتی ہے، جس میں علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے علامہ ابن الملک رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول نقل فرمایا ہے: " دراهم مستحقَّة الصرف إلى الحوائج الأصلية حوائجِ اصلیہ میں داخل ہیں، کیونکہ وہ کالمعدوم ہیں۔" اس کے بعد علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے تحریر فرمایا ہے کہ: "دیگر کتبِ فقہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حاجتِ اصلیہ کا اعتبار صرف ان اشیاء میں ہوتا ہے جن کی عین حاجتِ اصلیہ کے ساتھ مشغول ہوتی ہے، نقدین میں حاجتِ اصلیہ کا اعتبار نہیں ہوتا۔" (ملاحظہ فرمائیں عبارت نمبر: ۱)۔ فتویٰ بھی اسی قول پر ہے کہ نقدین میں حاجتِ اصلیہ کا اعتبار نہیں ہوتا۔

(جیسا کہ "امداد الفتاویٰ ۲/۵۹" میں حضرت حکیم الأمت رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی ایک سوال کے جواب میں تحریر فرمایا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے مکان خریدنے کی نیت سے پیسے جمع کر رکھے ہوں تو اس پر زکوٰۃ لازم ہوگی یا نہیں؟ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے جواب میں تحریر فرمایا ہے کہ "اس میں اختلاف ہے، مگر راجح وجوبِ زکوٰۃ ہے۔")

علامہ ابن الملک رحمہ اللہ تعالیٰ کے مذکورہ قول پر فتویٰ نہ دینے اور نقدین کو مطلقاً "حاجتِ اصلیہ" سے زائد قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ نقدین خلقۃً مالِ نامی ہیں، اور ان کی عین حاجتِ اصلیہ کے ساتھ مشغول نہیں ہوتی، لہٰذا اگر کسی شخص کے پاس نصاب کے بقدر دراہم، دنانیر یا نقدر قم ہو تو اس شخص کے لیے زکوٰۃ لینا جائز نہیں ہوگا، اور سال گذرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی، خواہ کسی بھی غرض کے لیے رکھے گئے ہوں۔ لیکن دراہم، دنانیر اور نقدی کے علاوہ دوسری اشیاء مثلاً پلاٹ وغیرہ خلقۃً نامی نہیں ہیں، اور ان کی عین حاجتِ اصلیہ کے ساتھ مشغول ہوتی ہے، اس لیے دیگر اشیاء کو دراہم، دنانیر اور نقدی پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، اور "مستحَقَّة الصرف الى الحوائج الأصلية" ہونے کی صورت میں انہیں "حوائجِ اصلیہ" میں داخل ماننے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ جیسا کہ "ردالمحتار" ہی میں یہ مسئلہ مذکور ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس سال بھر کا راشن ہو جس کی مالیت دو سو درہم ہو تو صحیح قول کے مطابق اس کے لیے زکوٰۃ لینا حلال ہے، علت یہ ذکر کی ہے: "لأنه مستحَق الصرف إلى الكفاية فيلحق بالعدم". (ملاحظہ فرمائیں عبارت نمبر: ۱، ۲ اور ۳)

Scanned by CamScanner

حاصل یہ کہ مذکورہ نکات کی روشنی میں راجح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جس شخص کے پاس ذاتی مکان نہ ہو اور اس کے پاس ایک ایسا پلاٹ ہو جو اس نے اپنی رہائش کی نیت سے خریدا ہو، لیکن تعمیری اخراجات کے لیے رقم نہ ہونے کی وجہ سے اس پلاٹ پر ابھی تک تعمیر نہ کی ہو، تو یہ پلاٹ "حوائج اصلیہ" میں داخل ہوگا، ایسے شخص کے لیے زکوۃ لینا حلال ہوگا، اور اس پر قربانی اور صدقۂ فطر واجب نہیں ہوں گے۔

(۱) ردالمحتار، کتاب الزکاۃ(۲/ ۲۶۲)ط:ایچ ایم سعید

قوله (وفسره ابن ملك) أي فسر المشغول بالحاجة الأصلية والأولى فسرها وذلك حيث قال وهي ما يدفع الهلاك عن الإنسان تحقيقا كالنفقة ودور السكنى وآلات الحرب والثياب المحتاج إليها لدفع الحر أو البرد أو تقديرا كالدين فإن المديون محتاج إلى قضائه بما في يده من النصاب دفعا عن نفسه الحبس الذي هو كالهلاك وكآلات الحرفة وأثاث المنزل ودواب الركوب وكتب العلم لأهلها فإن الجهل عندهم كالهلاك فإذا كان له دراهم مستحقة بصرفها إلى تلك الحوائج صارت كالمعدومة كما أن الماء المستحق بصرفه إلى العطش كان كالمعدوم وجاز عنده التيمم اه. وظاهر قوله فإذا كان له دراهم الخ أن المراد من قوله وفارغ عن حاجته الأصلية ما كان نصابا من النقدين أو أحدهما فارغا عن الصرف إلى تلك الحوائج لكن كلام الهداية مشعر بأن المراد به نفس الحوائج فإنه قال وليس في دور السكنى وثياب البدن وأثاث المنازل ودواب الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكاة لأنها مشغولة بحاجته الأصلية وليست بنامية أيضا اه. وبه يشعر كلام المصنف الآتي أيضا..... في البحر:و يخالفه ما في المعراج في فصل زكاة العروض أن الزكاة تجب في النقد كيفما أمسكه للنماء أو للنفقة وكذا في البدائع في بحث النماء التقديري اه. قلت: وأقره في النهر و الشرنبلالية و شرح المقدسي وسيصرح به الشارح أيضا ونحوه قوله في السراج سواء أمسكه للتجارة أو غيرها وكذا قوله في التاترخانية نوى التجارة أو لا.

(۲) بدائع الصنائع، کتاب الزکاۃ،فصل:الشرائط التی ترجع إلی المال(۲/ ۹۲) ط: المكتبة الرشيدية

الإعداد للتجارة في الأثمان المطلقة من الذهب والفضة ثابت بأصل الخلقة لأنها لا تصلح للانتفاع بأعيانها في دفع الحوائج الأصلية فلا حاجة إلى الإعداد من العبد للتجارة بالنية إذ النية للتعيين وهي متعينة للتجارة بأصل

Scanned by CamScanner

الحلقة فلا حاجة إلى التعيين بالنية فتجب الزكاة فيها نوى التجارة أو لم ينو أصلا أو نوى النفقة. وأما فيما سوى الأثمان من العروض فإنما يكون الإعداد فيها للتجارة بالنية لأنها كما تصلح للتجارة تصلح للانتفاع بأعيانها بل المقصود الأصلي منها ذلك فلا بد من التعيين للتجارة وذلك بالنية.

(٣) ردالمحتار، باب المصرف(٢/ ٣٤٧) ط:ايچ ايم سعيد

قوله (فارغ عن حاجته) قال في البدائع: قدر الحاجة هو ما ذكره الكرخي في مختصره لا بأس أن يعطى من الزكاة من له مسكن وما يتأثث به في منزله وخادم وفرس وسلاح وثياب البدن وكتب العلم إن كان من أهله فإن كان له فضل عن ذلك تبلغ قيمته مائتي درهم حرم عليه أخذ الصدقة لما روي عن الحسن البصري قال:كانوا يعني الصحابة يعطون من الزكاة لمن يملك عشرة آلاف درهم من السلاح والفرس والدار والخدم وهذا لأن هذه الأشياء من الحوائج اللازمة التي لا بد للإنسان منها. وذكر في الفتاوى فيمن له حوانيت ودور للغلة لكن غلتها لا تكفيه وعياله أنه فقير ويحل له أخذ الصدقة عند محمد وعند أبي يوسف لا يحل وكذا لو له كرم لا تكفيه غلته. ولو عنده طعام للقوت يساوي مائتي درهم فإن كان كفاية شهر يحل أو كفاية سنة قيل لا يحل وقيل يحل "لأنه مستحق الصرف إلى الكفاية فيلحق بالعدم" وقد ادخر عليه الصلاة والسلام لنسائه قوت سنة. ولو له كسوة الشتاء وهو لا يحتاج إليها في الصيف يحل ذكر هذه الجملة في الفتاوى اه. وظاهر تعليله للقول الثاني في مسألة الطعام اعتماده.وفي التاترخانية عن التهذيب أنه الصحيح. وفيها عن الصغرى: له دار يسكنها لكن تزيد على حاجته بأن لا يسكن الكل يحل له أخذ الصدقة في الصحيح. وفيها: سئل محمد عمن له أرض يزرعها أو حانوت يستغلها أو دار غلتها ثلاثة آلاف ولا تكفي لنفقته ونفقة عياله سنة يحل له أخذ الزكاة وإن كانت قيمتها تبلغ ألوفا وعليه الفتوى وعندهما لا يحل اه ملخصاً.

(٤) بدائع الصنائع،مصارف الزكاة (٢/١٥٨) ط: المكتبة الرشيدية

ثم لا بد من معرفة حد الغنا فنقول الغنا أنواع ثلاثة: غنى تجب به الزكاة وغنى يحرم به أخذ الصدقة وقبولها ولا تجب به الزكاة وغنى يحرم به السؤال ولا يحرم به الأخذ. أما الغنا الذي تجب به الزكاة فهو بأن يملك نصابا من المال النامي الفاضل عن الحاجة الأصلية، وأما الغنا الذي يحرم به أخذ الصدقة وقبولها فهو

Scanned by CamScanner

الذي تجب به صدقة الفطر والأضحية وهو أن يملك من الأموال التي لا تجب فيها الزكاة ما يفضل عن حاجته وتبلغ قيمة الفاضل مائتي درهم من الثياب والفرش والدور والحوانيت والدواب والخدم زيادة على ما يحتاج إليه كل ذلك للابتذال والاستعمال لا للتجارة والإسامة فإذا فضل من ذلك ما يبلغ قيمته مائتي درهم وجب عليه صدقة الفطر والأضحية وحرم عليه أخذ الصدقة.....الخ

(٥) المحيط البرهاني،الفصل الثامن:من توضع فيه الزكاة(٣/٢١،٢١٦) ط،ادارة القرآن،كراتشي.

وسئل محمد بن الحسن عمن له أراضي يزرعها، أو حوانيت يستغلها، قال: إن كان غلتها تكفي لنفقته ونفقة عياله سنة لا يحل له أخذ الزكاة، وهو قول أبي حنيفة، وأبي يوسف، وإن كان غلتها لا تكفي لنفقته ونفقة عياله سنة، قال محمد: يحل له أخذ الزكاة وإن كانتبلغ قيمتها ألوفا، قال محمد رحمه الله: لست أنظر في هذا إلى ثمنها، وإنما أنظر إلى دخلها، وقال أبو حنيفة، وأبو يوسف: لا يحل له أخذ الزكاة إذا كان تبلغ قيمتها نصاباً. والحاصل: أن ما يكون مشغولاً بحاجته الحالية نحو الخادم والمسكن، وثيابه التي يلبسها في الحال لا يعتبر في تحريم الصدقة بالإجماع، وما يكون فاضلاً عن حاجته الحالية، يعتبر في تحريم الصدقة، وإنما اعتبرنا الفراغ عن الحاجة الحالية في التحريم، لأنا لو اعتبرنا الفراغ عن الحاجة الحالية(١) لا يتصور التحريم؛ لأن الإنسان خلق، يحتاج إلى جميع ما في يديه في الثاني. إذا ثبت هذا فنقول: الضيعة فارغة عن الحاجة الحالية حقيقة، فاعتبرناها في تحريم الصدقة اعتباراً للحقيقة، وبقولهما أخذ أبو عبد الله البلخي. ومحمد رحمه الله اعتبرها من الحاجة الحالية؛ لأن الملك في الضيعة لا يستحدث ساعة فساعة، فمتى لم تبح له الصدقة يحتاج إلى بيعها إذا كانت غلتها لا تكفي لنفقته ونفقة عياله سنة، ويشق على كل أحد بيع الضيعة، فاعتبر الضيعة من الحاجة الحالية دفعاً للمشقة عن الناس. وبقوله أخذ محمد بن مقاتل ومحمد بن سلمة، بخلاف ما إذا كان غلتها تكفي لنفقته ونفقة عياله سنة؛ لأنه إذا كان كذلك لا يحتاج إلى بيعها لو لم تبح له الصدقة، فلا تعتبر الضيعة والحالة هذه من الحوائج الحالية، فتعتبر في تحريم الصدقة.

(١)كذا في طبعة دار الكتب العلمية و طبعة إدارة القرآن، و لايبدو صحيحاً بل هو خلاف سياق الكلام، والظاهر أنه محرّف عن "المآلية ".والله تعالىٰ اعلم.١٢.منه.

Scanned by CamScanner

(٦) فتح القدير،باب من يجوزدفع الصدقة إليه ومن لايجوز(٢/ ٢٠٢)
ط: المكتبة الرشيدية

والحاصل أن النصب ثلاثة: نصاب يوجب الزكاة على مالكه وهو النامي خلقة أو إعدادا وهو سالم من الدين،ونصاب لا يوجبها وهو ما ليس أحدهما فإن كان مستغرقا بحاجة مالكه حل له أخذها وإلا حرمت عليه كثياب تساوي نصابا لا يحتاج إلى كلها أو أثاث لا يحتاج إلى استعماله كله في بيته وعبد وفرس لا يحتاج إلى خدمته وركوبه ودار لا يحتاج إلى سكنها فإن كان محتاجا إلى ما ذكرنا حاجة أصلية فهو فقير يحل دفع الزكاة إليه وتحرم المسألة عليه،ونصاب يحرم المسألة وهو ملك قوت يومه أو لا يملكه لكنه يقدر على الكسب أو يملك خمسين درهما على الخلاف في ذلك.

(٧) الفقه على المذاهب الأربعة، كتاب الحج(١/ ١٠٠٣)

الاستطاعة هي القدرة على الزاد والراحلة بشرط أن يكونا زائدين عن حاجاته الأصلية: كالدين الذي عليه والمسكن والملبس والمواشي اللازمة له وآلات الحرفة والسلاح وأن يكونا زائدتين عن نفقة من تلزمه نفقتهم مدة غيابه إلى أن يعود ويعتبر في الراحلة ما يليق بالشخص عادة وعرفا ويختلف ذلك باختلاف أحوال الناس.

(٨) الفقه الإسلامي وأدلته، كتاب الأضحية(٤/ ٢٤٥)

المطلب الثاني . حكم الأضحية :اختلف الفقهاء في حكم الأضحية، هل هي واجبة أو هي سنة؟فقال أبو حنيفة وأصحابه: إنها واجبة مرة في كل عام على المقيمين من أهل الأمصار، وذكر الطحاوي وغيره: أن على قول أبي حنيفة: واجبة، وعلى قول الصاحبين (أبي يوسف ومحمد): سنة مؤكدة. وقال غير الحنفية: إنها سنة مؤكدة غير واجبة، ويكره تركها للقادر عليها.....ودليل الحنفية على الوجوب: هو قوله عليه السلام: «من وجد سعة، فلم يضح، فلا يقربن مصلانا»....واستدل الجمهور على السنية للقادر عليها بأحاديث: منها حديث أم سلمة: «أن رسول الله صلّى الله عليه وسلم قال: إذا رأيتم هلال ذي الحجة: وأراد أحدكم أن يضحي، فليمسك عن شعره وأظفاره» ففيه تعليق الأضحية بالإرادة، والتعليق بالإرادة ينافي الوجوب..... وضعف أصحاب الحديث حديث الحنفية، أو هو محمول على تأكيد الاستحباب كغسل الجمعة في حديث: «غسل الجمعة واجب على كل محتلم» . ويرشد

Scanned by CamScanner

إليه الأثر: «أن أبا بكر وعمر كانا لا يضحيان، مخافة أن ترى الناس ذلك واجباً.والأصل عدم الوجوب» . ودليل الشافعية على أن الأضحية سنة كفاية لكل بيت: حديث مِخْنَف بن سُلَيم قال: «كنا وقوفاً مع النبي صلّى الله عليه وسلم ، فسمعته يقول: يا أيها الناس، على كل أهل بيت في كل عام أضحية..» ، ولأن الصحابة كانوا يضحون في عهده صلّى الله عليه وسلم ، والظاهر اطلاعه، فلا يُنكر عليهم . وقد ضحى النبي صلّى الله عليه وسلم بكبشين سمينين أقرنين أملحين، أحدهما عن أمته، والثاني عن نفسه وآله.

(٩) الموسوعة الفقهية الكويتية، كتاب الأضحية(٥/ ٧٦)

حكم الأضحية : ذهب جمهور الفقهاء ، ومنهم الشافعية والحنابلة ، وهو أرجح القولين عند مالك ، وإحدى روايتين عن أبي يوسف إلى أن الأضحية سنة مؤكدة . وهذا قول أبي بكر وعمر وبلال وأبي مسعود البدري وسويد بن غفلة وسعيد بن المسيب وعطاء وعلقمة والأسود وإسحاق وأبي ثور وابن المنذر.. واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

عبداللہ ولی عفی عنہ

عبداللہ ولی عفی عنہ

دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی

١٧/ربیع الاول/١٤٣٧ھ

٢٩/دسمبر/٢٠١٥ء

الجواب صحیح
بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ
١٧/٣/١٤٣٧ھ

الجواب صحیح
احقر محمود اشرف غفر اللہ لہ
٢٢/٣/١٤٣٧ھ

الجواب صحیح
الجواب صحیح
شاہ محمد تفضل علی عفی عنہ
٢٨/٣/١٤٣٧ھ

الجواب صحیح
٢٢/٣/١٤٣٧ھ

الجواب صحیح
محمد یعقوب
٢٣/٣/١٤٣٧ھ

الجواب صحیح
٢٢/٣/١٤٣٧ھ

الجواب صحیح
محمد عبدالمنان عفی عنہ
٢٥/٣/١٤٣٧ھ

الجواب صحیح
عبدالحمید
٢٨/٣/١٤٣٧ھ

دارالافتاء
فتویٰ نمبر ٨١/١٧٦٩